میں شامل کر لیا گیا۔ فلسفہ اور منطق کی کتابیں کم و بیش اسی دور میں نصاب تعلیم میں شامل کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ ایسے فلسفیانہ نظریات کا تنقیدی مطالعہ کر کے ان کا ابطال کیا جائے جو اسلامی تعلیمات سے متعلق شکوک و شبہات پیدا کر سکتے تھے۔ علم کلام کی تشکیل اسی مقصد کو سامنے رکھ کر کی گئی۔

علاوہ ازیں چونکہ قرآن اور حدیث کو سمجھنے کے لئے عربی زبان، اس کے محاورات اور کمالات سے واقفیت ضروری تھی، اسی لئے عربی گرائمر ـــ صرف، نحو ـــ کی تشکیل ہوئی۔ پھر قرآن کی فصاحت و بلاغت کو سمجھنے کے لئے، جو اپنی مثال آپ تھی، علم بیان و معانی کی تشکیل ہوئی تاکہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کے لطیف پہلوؤں کا ذوق پیدا ہو سکے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ عربی گرائمر اور علم بیان و معانی کا مطالعہ بھی بجائے خود کوئی مقصد نہ تھا۔ بلکہ ان علوم کی تعلیم کو قرآن و حدیث ہی کی خدمت کے لئے شامل کیا گیا تھا۔

دینی مدارس کی تعلیم کا مقصد اس تعلیم کا بنیادی مقصد دین کا تحفظ اور اس کی اشاعت تھا۔ موجودہ دینی مدارس کا نصب العین بھی صرف یہی ہے کہ دینی تعلیمات کا تحفظ کیا جائے، اس سے زیادہ ان مدارس کی بساط بھی نہیں ہے۔ اصل کام جو موجودہ حالات میں ہمارے کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ جو دین بزرگوں سے ہم تک پہنچا ہے، وہی محفوظ رہے۔ اس سے آگے بڑھ کر کچھ اور کرنے کے لئے نہ ہمارے پاس وسائل ہیں اور نہ فنڈز۔ کوئی متوازن نصب العین مدارس دینیہ اس وقت اپنے سامنے رکھیں گے۔ جب حکومت بھی تعاون کرے گی اور اس کار خیر میں حصہ لے گی، لیکن حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس اعتماد کا اہل اور قابل ہی ثابت نہیں کرتی کہ وہ اس کام میں کوئی حصہ لے سکے۔

مدارس دینیہ کی تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت اور گنجائش میرے نزدیک اپنے مقصد اور نصب العین کے اعتبار سے اس نظام تعلیم میں کوئی ایسی کمی نہیں ہے، جسے دور کرنے کے لئے اس میں بنیادی تبدیلیاں کی جائیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نظام نے اب تک جتنے افراد پیدا کئے ہیں۔ وہ علم و دانش کے لحاظ سے قابل لوگ تھے۔ اگر اس نظام تعلیم میں کوئی کمی ہوتی تو یہ علماء اور فضلاء کیسے پیدا ہوتے۔؟ سبھی علماء و فقہاء اسی نظام تعلیم سے پڑھ کر نکلے ہیں۔

جہاں تک اس نظام تعلیم میں ترمیم و تبدیلی کا سوال ہے۔ تو شریعت کی کلیات میں تو کسی بھی ترمیم و تنسیخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم قرآن و حدیث کے کسی حصے کو تو حذف نہیں کر سکتے۔ اس کے لئے تو امکان صرف اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ جب ہم خدانخواستہ اسلام ہی کو چھوڑ دیں۔

صاف بات ہے کہ اگر کوئی شخص آج یہ کہتا ہے کہ موجودہ دور میں سود کی حرمت اور پانچ وقت کی نماز چلنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ اور یہ کہ نماز پڑھنے سے دفتروں اور کارخانوں کے کام میں حرج ہوگا، تو ہم ان دلائل کی بناء پر نہ تو سود کو جائز قرار دے دیں گے اور نہ ہی نماز کو ساقط کر دیں گے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

البتہ جہاں تک مدارس دینیہ میں پڑھائے جانے والے دیگر علوم کا تعلق ہے۔ مثلاً فلسفہ منطق اور کلام وغیرہ تو ان میں تبدیلی اور ترمیم و تنسیخ کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن اسکی جو صورت ہمارے لئے قابلِ قبول ہوگی وہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام کی تمام حکومتوں کی سرپرستی میں جدید علوم کے چیدہ چیدہ ماہرین پر مشتمل ایک بورڈ قائم کیا جائے۔ یہ بورڈ جدید علوم فلسفہ، منطق، کلام اور علوم عمرانیات کا ایک خلاصہ تیار کرے۔ پھر دنیائے اسلام کے منتخب علماء مل کر ان جدید علوم کے ان پہلوؤں کا ابطال تیار کریں جو قرآن و سنت کی تعلیمات سے متصادم ہوں، اس طرح جو مجموعے مرتب ہوں، انہیں دینی مدارس کے نصاب میں شامل کر لیا جائے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل امور کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے۔

۱۔ تبدیل شدہ نصاب کو صرف اسی صورت میں درس نظامی میں شامل کیا جائے گا۔ جب اس کے لئے اجتماعی کوشش کی جائے گی۔ بیشک انفرادی سطح پر ہمارے ہاں بہت قیمتی کوششیں ہوئی ہیں۔ اور سوشلزم، سرمایہ داری اور اشتراکیت کی رد میں جو کتابیں اور رسائل لکھے گئے ہیں، ان سے ہمارے نوجوان طبقے نے استفادہ بھی کیا ہے۔ تاہم یہ ساری کوششیں چونکہ انفرادی تھیں۔ اس لئے انہیں مدارس دینیہ کے نظامِ تعلیم میں شامل نہیں کیا جا سکا۔

۳۔ تبدیل شدہ نصاب کے مجموعے مرتب کرتے وقت یہ بات پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ مخالفینِ اسلام کے اقوال و نظریات ہی کو جمع کر کے نہ پڑھا دیا جائے۔ بلکہ ان کے ساتھ ساتھ قرآن و حدیث اور عقل کی روشنی میں ان کا رد اور ابطال بھی طلبہ کو پڑھایا جائے۔

۴۔ اس کام میں جدید علوم کے ماہرین اور علوم اسلامیہ کے ماہرین کا باہمی تعاون بے حد ضروری ہے۔

۵۔ تبدیل شدہ نصاب کے مجموعے عربی زبان میں مرتب کئے جائیں۔

علوم عمرانیات کا شامل ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم خود چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے اور وسائل مہیا فرمائے تو ہم اپنے مدرسے میں علوم عمرانیات کو شامل کر لیں۔ لیکن اصل مسئلہ وسائل اور اساتذہ کا ہے۔

اس سلسلے میں خود طلبہ کا رویّہ بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔ طلبہ بھی نئے علوم نہیں پڑھنا چاہتے۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں اور صرف پرانی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ طلبہ جب چاہتے ہیں۔ ایک مدرسہ چھوڑ کر دوسرے مدرسے میں چلے جاتے ہیں۔

حکومت کی مداخلت | اگر حکومت دینی مدارس میں مداخلت کرنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ پہلے اپنے حسنِ نیت کا اعتبار اور ثبوت بہم پہنچائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اُسے اصلاح کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظامِ تعلیم کی اصلاح کا کام کیوں نہیں کرتی۔؟ اس سے اُسے کون روک رہا ہے۔؟

دینی مدارس کے نظامِ تعلیم نے گذشتہ بارہ سو سال سے اسلام کو باقی رکھا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اب اگر اس کو بھی بدل دیا جائے۔ جبکہ اس کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسرا نظام بھی موجود نہیں ہے، تو کیا اس سے خطرناک نتائج پیدا نہ ہوں گے۔؟

درسِ نظامی میں قرآن و حدیث کا مطالعہ | آپ دیکھیں گے کہ مدارسِ دینیہ میں معادن علوم پانچ یا چھ سال میں پڑھائے جاتے ہیں۔ آخری دو سالوں میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی ہے فلسفے کی بڑی اور غیر ضروری کتابیں حذف کر دی گئی ہیں۔ ہم بھی منطق اور فلسفہ کے حصّے کم کر رہے ہیں۔ لیکن فلسفہ و منطق کو بالکل ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی عدم موجودگی سے طلبہ کی علمی اور ذہنی صلاحیتوں میں ضعف پیدا ہونے کا امکان ہے۔

طریقِ تعلیم اور دورِ جدید کے مسائل | آپ کی یہ رائے درست ہے کہ حدیث کی تعلیم کے دوران اکثر مدارس میں اصولی مسائل پر کم اور فروعی، اختلافی مسائل پر بحث زیادہ ہوتی ہے۔ آج سے چھ سو برس پہلے کا جو دور گزرا ہے۔ اس میں متعدد اختلافی بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ ان اختلافی بحثوں کا اثر مدارس کی تعلیم پر بھی پڑا ہے۔ مجھے آپ کی اس بات سے اتفاق ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیم کے دوران اساتذہ کو موجودہ دور کے مسائل کو زیرِ بحث لانا چاہیئے۔ جب تک کہ مذکورہ بالا تجویز کے مطابق کوئی مستقل نصاب نظریاتِ باطلہ کی رد کے لئے رائج نہیں ہوتا۔ اس وقت تک نظامِ تعلیم میں فروعی اختلافی مسائل سے توجہ ہٹا کر اصولی مسائل پر توجہ کی جائے۔ عالمِ اسلام کے مسائل، جاہلیہ دور کے حالات و کوائف اور معاشرتی اور اقتصادی امور بھی زیرِ بحث لائے جائیں تاکہ طلبہ میں دورِ جدید کے مسائل کا فہم اور شعور پیدا ہو سکے۔

دراصل درسِ نظامی کا مقصد ہی یہی ہے کہ طلبہ میں مطالعے کی ابتداء کرا دی جائے اور ان میں مطالعہ

تحقیق کا ذوق پیدا کر دیا جائے۔ درسِ نظامی سے فارغ ہونے والا طالب علم عالم نہیں بن جاتا جسطرح منطق پر دو تین کتابیں پڑھ کر کوئی شخص منطقی نہیں بن جاتا۔ درسِ نظامی تو طلبہ میں اس بات کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ کہ وہ مزید مطالعہ و تحقیق کے قابل ہو سکیں۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ طلبہ میں مطالعے کے ذوق کی کمی ہے۔ اور مطالعے سے گھبراتے ہیں۔

مدارسِ دینیہ میں پیشہ ورانہ تربیت | پہلی بات تو یہ ہے کہ اس تعلیم کا مقصد معاش کمانا ہے ہی نہیں۔ ہمارے ہاں تصوّر یہ ہے کہ دین کو سیکھیں، اس پر عمل کریں اور اس کی اشاعت کریں نہ یہ کہ اس سے معاش کمانے کی کوشش کریں۔

تاہم آپ کی یہ بات درست ہے کہ موجودہ دور میں پیشہ ورانہ تربیت کی بھی ضرورت ہے۔ دراصل پرانے زمانے میں توکّل اور قناعت بہت تھی۔ علماء مساجد اور مدارس میں بغیر معاوضہ یا تنخواہ لئے دین کی خدمت کرتے تھے، جَو کی سوکھی روٹی پر بھی خوش تھے۔ اب اس دور میں یہ جذبہ ناپید ہو رہا ہے۔ اب ضروری ہے کہ مدارسِ دینیہ کے طلبہ کو کچھ ایسے فنون سکھا دئے جائیں جن سے وہ آزادانہ طور پر اپنی روزی کما سکیں۔ ان فنون میں طب، خوشنویسی، درزی کا کام، جلد بندی وغیرہ کا کام وغیرہ شامل کئے جا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں میرا عملی تجربہ یہ رہا ہے کہ جن لوگوں نے کوئی اور کام سیکھا ہے، وہ پھر اُسی کام کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔ حتّٰی کہ اسکولوں اور کالجوں میں عربی اور اسلامیات پڑھانے پر بھی جو لوگ مامور ہوتے ہیں، ان کا عالم بھی یہ ہے کہ اپنی تین تین چار چار سو روپے کی تنخواہوں میں مگن ہو کر دین کو بھول چکے ہیں۔

اسکولوں، کالجوں میں دینی تعلیم | حکومتی نظام کے تحت جو تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ ان میں صدقِ دل سے دین کی خدمت نہیں ہو رہی۔ ظاہر ہے کہ تین چار سورتوں کو یاد کر کے یا ان کا ترجمہ پڑھ کر دینی تعلیم کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے اس کے لئے علومِ اسلامیہ سے کلّی آگاہی ضروری ہے۔ کالجوں میں زیادہ سے زیادہ بچوں کو یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ وہ مسلمان ہیں۔ اور یہ کہ نماز وغیرہ کیسے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسلام کی بنیاد پر امریکہ، روس اور چین کے باطل نظریات کا مقابلہ کر سکیں تو اس کے لئے یہ بات کافی نہیں ہو گی، اس کے لئے علومِ اسلامیہ کا گہرا مطالعہ کرنا ہو گا۔

اجتہاد کی ضرورت، گنجائش | اجتہاد کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اگر اجتہاد کی کھلی

اجازت دے دی جائے۔ تو پھر آپ کو ہر گلی اور ہر محلے میں دس دس بیس بیس مجتہد ملیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی احکام و شریعت کے متعلق تصادم و انتشار کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔

یہ جو ہمارے اکابر نے کہا ہے کہ اجتہاد کا سلسلہ بند ہو چکا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب انفرادی رائے نہیں دی جائے گی۔

اب جو مسائل پہلے زمانے میں پیش آ چکے ہیں اور قرآن و حدیث میں ان کے متعلق فیصلہ دیا جا چکا ہے تو ان میں اجتہاد کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں انہیں کسی قاعدہ اور اصول کے تحت حل کیا جائے۔؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اجتہاد کی شرائط کو کماحقہٗ پورا کر کے ان مسائل پر اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ بہتر صورت یہ ہو گی کہ چیدہ چیدہ علماء مل کر بیٹھیں اور زیر بحث مسئلے کے مالۂ و ماعلیہ پر غور کر کے کسی متفقہ فیصلے پر پہنچیں۔ اس اجتماعی کوشش میں یقیناً اللہ تعالیٰ کی خوشنودی شامل ہو گی۔

روح المعانی اور مرقات

تفسیر روح المعانی عربی از علامہ آلوسی بغدادیؒ کامل ۱۵ جلد (۳۰ پارے)

رعائتی ہدیہ غیر مجلد { کاغذ امپیٹیشن آرٹ۔ طباعت عکس مصری ۵۳۰/۰۰ روپے
کاغذ سفید گلیز " " " ۳۷۵/۰۰ "

مرقات شرح مشکوٰۃ عربی از ملا علی قاریؒ کامل ۱۱ جلد۔

کاغذ امپیٹیشن آرٹ، طباعت جدید ٹائپ۔ رعائتی ہدیہ غیر مجلد ۷۰۰/۰۰ روپے

نوٹ:۔ اگر روح المعانی اور مرقات مجلد پشتہ چرم درکار ہو تو فی جلد ۷/۰۰ روپے مزید شامل فرماویں۔ خرچہ خریدار کے ذمہ ہوگا۔

آرڈر میں کاغذ، مجلد و غیر مجلد کی وضاحت اور ایک سو روپیہ پیشگی آنا ضروری ہے۔

مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ـــ ملتان شہر

مولانا صادق حسن عقیل
ندائے فرقان۔ بنگلور

قرآن کے تاریخی حقائق اور جدید تحقیقات

کشتیٔ نوح

انیسویں ۱۹ صدی کے بعض روشن خیال محققین نے آدم و نوح و ابراہیم اور لوط علیہم السلام کی تاریخی شخصیتوں کا انکار ہی کر دیا تھا۔ اور ان کے واقعات کو مذہبی افسانے کہہ کر اٰن کی تاریخی حیثیت کو ناقابل تسلیم قرار دے دیا تھا مگر خدا کے فضل و کرم سے اس بیسویں صدی سے تحقیق کا رُخ برابر بدلتا جارہا ہے۔ مذہبی حقائق کی تاریخی حیثیت اب ناقابل تسلیم سے چار و ناچار قابلِ تسلیم بنتی جارہی ہے۔

خصوصاً حضرت نوحؑ کے زمانے کے طوفان کی عمومیت اور ان کی کشتی کے موجود ہونے کے انکشافات قابلِ ملاحظہ ہیں۔

کلامِ ربانی میں کشتیٔ نوح سے متعلق صاف طور پہ بتلایا گیا تھا کہ وَجَعَلْنٰهَا اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (اور ہم نے اس (کشتی) کو اہلِ عالم کے لئے ایک نشانی بنا چھوڑا ـــــ آج سے چند سال بیشتر تک چونکہ کشتی سے متعلق تفصیلی معلومات سامنے نہ آسکی تھیں اس لئے بعض مفسرین نے جَعَلْنٰهَا کی ضمیر سفینۂ نوح کی جانب لوٹانے کی بجائے ایک محذوف (یعنی لفظ قصّہ یا لفظ عقوبۃ) کی طرف لوٹائی ـــــ یعنی ہم نے ان کے قصّہ کو یا ان کی سزا کو ایک یادگار بنا دیا۔

اگرچہ بعض تفسیروں میں اس بات کا بھی تذکرہ ہے کہ جہاد موصل میں بعض لوگوں نے اسے دیکھا بھی تھا۔ مگر کس نے دیکھا اور کہاں دیکھا۔؟ پھر کیا کیا تحقیقات کی گئیں، اس کی کوئی تفصیل ہمیں قطعاً نہیں ملتی۔ بلکہ بعض تفاسیر میں تو اسے ضعیف قول کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ مگر اب ساری بات کھل کر سامنے آچکی ہے۔ پہلے تو فرانسیسی محقق فرے ننڈ ناورا (FERENAND NAVARRA) کے ذریعہ ہوئی۔ انہیں کوہِ ارارات پر ایک لکڑی شاہ بلوط کی جس کی جسامت $\frac{5 \times 5}{15}$ تھی اور اس کا وزن 50 پونڈ تھا دستیاب

ہوئی۔ لکڑی کی عمر کا اندازہ 5 ہزار سال کا لگایا گیا، جو حضرت نوحؑ کا عین زمانہ ہے۔ لیکن خدا کے فضل سے اب پوری کشتی کا ہی سراغ لگ چکا ہے۔

روسی ہواباز ولاڈ ہیر ردسکو وسکی نے آرمینیا کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک بڑی چیز دیکھی جس کے الوکھے پن نے اُسے نیچے اترنے پر مجبور کر دیا۔ جہاز سے جب وہ اترا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ کہ ایک بہت بڑی کشتی منجمد برف میں پھنسی ہوئی تھی۔ جہاز کے ذمہ دار کو بھی بلا لیا گیا اس نے جب دیکھا کہ ایک بہت بڑی کشتی ایک دشوار گزار اور بلند پہاڑ پر (جہاں کسی بھی انسان کی آمد و رفت کا نشان نہیں ہے۔) موجود ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا:

"مجھے تو یہ وہی کشتی معلوم ہوتی ہے جو مذہبی کتابوں میں "کشتیٔ نوحؑ" کے نام سے مشہور ہے۔"

پھر یہ لوگ واپس ہوگئے۔ اس کے بعد دو فوجی دستے چند محققین کے ساتھ آئے۔ بڑی مشکل سے کشتی کے اندر نیچے موجود کمروں کی پیمائش بھی انہوں نے کی۔ دیکھا کہ کئی کمرے مختلف انداز پر بنے ہوئے ہیں۔ ان میں بعض کمرے بہت بڑے تھے جو ہاتھی کے قابل ہو سکتے تھے۔ بعض بہت اونچے تھے جو اونٹ کے رہنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

اس جماعت کے واپس ہو جانے کے بعد ایک تیسری جماعت تُرک احباب کی پہنچی، ان کے بیان کے مطابق جس کا طول و عرض $\frac{300 \times 50}{30}$ ہے جس کے باہر کے حصہ پر تارکول (ڈامبر) جیسا کوئی مادہ لگایا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے، کہ ۱۸۸۲ء کے ایک زلزلہ میں اصلی جگہ سے ہٹ کر موجودہ گڑھے میں آرہی ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ جبل وام (VAM) کے جنوب مغرب میں جو پہاڑی سلسلہ ارارا ط کا چلا ہے۔ اسی کی ایک چوٹی کا نام "جودی" ہے۔ اسی لفظ جودی کا تذکرہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ قدیم تورات میں بھی یہی لفظ تھا۔ سریانی و کلدانی زبان کی تورات میں بھی اب تک یہی لفظ ہے۔ مگر دوسرے موجودہ تراجم میں لفظ ارارا ط ہے، جودی کا نام نہیں ہے۔ جو بعض کم فہم احباب کے لئے باعث اشکال تھا کہ تمہارے قرآن میں یہ لفظ جودی کہاں سے آگیا؟ خدا کا فضل ارارا ط اور جودی کی تحقیق بھی سامنے آچکی ہے۔

نیز اس بات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ آج کل کی سائنس میں علم طبقات الارض میں ایک مستقل شعبہ طوفانِ نوح سے متعلق قائم کر دیا گیا ہے جسے (DELAGE GEDAGY) کہا جاتا

ہے۔ خصوصاً دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ سائنس دانوں کا ایک وفد جب قطب شمالی کی سیاحت پر روانہ ہوا تو اُسے اس سفر میں اس قدر سائنٹفک انکشافات حاصل ہوئے کہ شمالی روس کے علاقہ سائبیریا میں ایک مستقل تحقیقاتی ادارہ بنام "فلسفۂ کہردائمی کا ادارۂ تحقیقات" قائم کر دیا گیا جس نے طوفانِ نوح سے متعلق ایسے ایسے انکشافات کئے ہیں اور ایسے عمدہ قسم کے استدلالات کئے ہیں جو دیکھنے اور سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعہ آپ کو جدید معیارِ تحقیق و تنقید کا بھی ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مذکورہ اکیڈمی کے انچارج پروفیسر گریاز نوف (GRYAZNOV) نے حال ہی میں کوہِ التائی کے دامن کو اپنا تحقیقاتی مرکز قرار دیکر برف کے منجمد ٹیلوں کی کھدائی شروع کی تو تقریباً پچاس قدم کی کھدائی کے بعد گھوڑوں کا ایک اصطبل خانہ نمودار ہوا جو لکڑی کی چھت کا تھا۔ اس کے اندر دس گھوڑے صحیح و سالم مگر برف میں ٹھٹھرے ہوئے بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کب انہیں پیغامِ اجل ملا تھا۔ مگر تمام اعضاء حیرتناک حد تک درست اور محفوظ تھے۔ زین کسی ہوئی ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مالکوں کو ہونے والے کسی شدید برف باری یا طوفان کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ان گھوڑوں پر سوار ہو کر کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نکلنے کا منصوبہ بنا ہی رہے تھے کہ برف باری میں پھنس کر رہ گئے۔ اس وقت دریافت شدہ گھوڑوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ان کے معدوں میں نیم ہضم غذا بھی موجود ہے۔ زین کا چمڑہ عمدہ ہے اور رکابوں پر معمولی قسم کا سنہرا کام بھی کیا ہوا ہے۔ قیاس ہے کہ قرب و جوار میں کہیں ان کے مالکوں کا بھی سراغ لگ جائے گا۔

بہرحال اس عجیب و غریب انکشاف سے علمی دنیا میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور مختلف قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ کچھ لوگ نظریۂ طوفانِ نوح کی صداقت اس انکشاف سے کرنے لگے اور بعض احباب نے اس نظریہ کا انکار کرتے ہوئے یہ توجیہ کی کہ وہ ڈھانچے درحقیقت منطقۂ منجمدہ کے جانوروں کے ہیں جو اپنی غذا کی تلاش میں نسبتہً سرسبز علاقوں کی جانب نکل گئے اور برف باری کا شکار ہو گئے۔

اس معاملے میں ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں سب سے بڑی دلیل یہ دی گئی ہے کہ جن حیوانات کے ڈھانچے اب تک وہاں مل سکے ہیں، ان میں قدیم زمانے کا ہاتھی بھی ہے۔ اور ہاتھی میں تیرنے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ خصوصاً ہاتھی کی لاش جوں جوں سڑ کر پھولنے

لگتی ہے۔ اسی قدر وہ سطح آب پر تیرنے کے لئے زیادہ موزوں ہو جاتی ہے۔ کئی کئی آدمی بیک وقت اس پر سوار ہو کر دریا پار کر جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے۔ کہ یہ ڈھانچے ان جانوروں کے ہیں جو طوفانِ نوح میں غرقاب ہو گئے تھے۔ کیونکہ اگر واقعتہً زبردست طوفان کا حادثہ ہوا تھا تو زندہ و مردہ سبھی ہاتھی سیلاب میں بہہ کر سینکڑوں میل آگے نکل جاتے اور خشک علاقوں میں گل سڑ کر ختم ہو جاتے۔ پھر وہ سائبیریا کے علاقے میں دستیاب کیسے ہو گئے۔؟

یہ تھی وہ دلیل جو ان کے پاس زیادہ وزنی سمجھی گئی تھی اور اس کو بنیاد بنا کر واقعہ طوفانِ نوح کی وہ بدستور تکذیب کرتے رہے لیکن ان کے خیالات کی سب سے پہلے تردید ڈاکٹر نیوویل (DR. H.H. NEVVILLE) نے کی۔ انہوں نے ان جانوروں کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد یہ ثابت کیا کہ سائبیریا کے برفستانوں میں جو ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں وہ منطقہ معتدل کے ہیں۔ وہ منطقہ منجمد کے ہو نہیں سکتے۔

۱۔ کیونکہ ان کے اجسام میں ایک طرف پسینہ کے وہ غدود موجود ہیں جو منطقہ منجمد کے جانوروں میں پائے نہیں جا سکتے۔

۲۔ دوسری جانب ان کی جلدوں پر ایسے گھنے بالوں کا قطعاً کوئی نشان نہیں ہے جن کا منطقہ منجمد کے جانوروں پر ہونا از حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر جیمس اور ان کے چند ہم خیال احباب نے مزید تحقیقات کے بعد چند اور دلائل بھی فراہم کئے ہیں۔

۳۔ ان کا کہنا ہے کہ ان جانوروں کے معدہ سے جو دانہ چارہ نکلا ہے اس کا تعلق منطقہ معتدل کی پیداوار سے ہے۔ لہٰذا یہ قرین قیاس ہے کہ وہ خوفناک عالمگیر طوفان میں بہتے ہوئے منطقہ معتدل سے منطقہ منجمد تک پہنچ کر برف کے تودوں میں دب کر رہ گئے۔

۴۔ طوفانِ نوح کے منکروں کا کہنا یہ تھا کہ یہ ڈھانچے ان جانوروں کے ہیں جو منطقہ منجمد میں تھے۔ اور تلاشِ غذا میں یہاں تک پہنچ گئے ـــــ لیکن ان سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ جب ہندوستان جیسے ملک میں (جو ہاتھیوں کی نشوونما کے لئے بے نظیر ہے۔) نسبتہً چھوٹے قد کے ہاتھی ہوتے ہیں۔ تو پھر کس طرح یہ مان لیا جائے کہ ایک خالص برفستانی علاقے میں اس قدر عظیم الجثہ جانور پایا جائے جو ہندوستان کے ہاتھیوں سے بھی اپنی جسامت میں دوگنے ہوں۔؟ ـــــ لہٰذا ماہرین طبقات الارض کے اس نظریئے کو مانے بغیر چارا نہیں کہ دنیا کی آب و ہوا میں طوفانِ نوح کے بعد زبردست تغیر و تبدل

ہوا ہے۔ جس کے بعد ہی منطقۂ منجمد بھی موجود ہو سکا ہے۔ اس سے پہلے منطقۂ منجمد کا کوئی پتہ نہ تھا۔

۵۔ تھوڑی دیر کے لئے نظریۂ طوفان کے منکرین واقعۂ طوفان کو مانتے ہوئے یہ دوسرا اعتراض اگر پیش کر دیں کہ یہ ہاتھی تیر کر بہت دور کیوں نہ نکل گئے؟ تو ہم جواب میں یہ کہیں گے کہ موجودہ ہاتھیوں کے برخلاف دستیاب شدہ ہاتھیوں کی ہڈیاں ٹھوس اور وزن دار ہونے کی بجائے اسفنجی ساخت کی ہیں جس سے ان میں زیادہ دور تک تیرنے کی صلاحیت نہیں رہ سکتی۔

۶۔ ان منکرین کی یہ دلیل بھی آخر کتنی کمزور ہے کہ منطقۂ منجمد کے جانور اپنی غذا کی تلاش میں مقابلۃً زیادہ سرد علاقوں کیطرف نکل گئے۔ اگر جانوروں کی طبیعت میں یہ رجحان پایا جاتا کہ غذا کی تلاش زیادہ سرد مقامات پر پہنچ کر کرنی چاہیئے تو اس کا سلسلہ آج بھی جاری رہنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ اور محتاج ثبوت ہے۔

۷۔ دستیاب شدہ ڈھانچے زمین کی کافی گہرائی سے برآمد ہوئے ہیں جن پر خشک شدہ کیچڑ اور گھونگھوں وغیرہ کی تہ چڑھی ہوئی ہے۔ اس سے بخوبی پتہ چلتا ہے کہ یہ جانور سیلاب سے پیدا ہونے والی دلدل میں دھنس کر ہلاک ہوئے ہیں جن پر برفانی کفن چڑھ گیا یا برف کے تودے ان کے لئے تابوت و مقبرہ بن گئے اور ان "سرد خانوں" میں ان کے جسم محفوظ رہ گئے۔ محض برف سے یہ دب گئے ہوتے تو کیچڑ اور گھونگھوں کی موجودگی کا کیا معنی رکھتی ہے؟

۸۔ برآمد شدہ جانوروں کے سروں کے اندر خون کی نالیوں میں امتلاء کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ تمام آثار و علامات پائے جاتے ہیں۔ جو غرقابی کی شکل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

۹۔ تمام ہی اجسام برف اور تاریکی میں پوری طرح محفوظ ہو جایا کرتے ہیں زمانہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ (جیسا کہ کوہ الٹائی پر دستیاب شدہ گھوڑوں کا تذکرہ گذر چکا۔) مگر سائبیریا کے بعض برفانی علاقوں ہی میں قدیم جانوروں کے ایسے ڈھانچے بھی برآمد ہوئے جو شکستہ حالت میں ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ان جانوروں کے ڈھانچے ہیں جو خشک علاقوں کے ہیں۔ ان کی موت برف باری سے نہیں ہوئی مردہ جانوروں کے یہ ڈھانچے خشک علاقوں سے سیلاب میں بہہ کر آئے اور یہاں دفن ہو گئے۔

۱۰۔ ایک سائبیریا ہی نہیں شمالی امریکہ اور قطب شمالی کے بہت سارے منجمد علاقوں میں اور ہمالیہ وغیرہ کی چوٹیوں پر غیر علاقوں کے بڑے بڑے جانوروں کے ایسے ڈھانچے برآمد ہوتے رہتے ہیں جن کی عمدہ توجیہ طوفانِ نوح کے عالمگیر سیلاب ہی سے کی جا سکتی ہے۔

ہمارے اسلاف — مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل ۔ لائلپور

فقہ ایک نومسلم انگریز خاتون کے اسلام لانے کا

تحریک ریشمی رومال میں مولانا عزیر گل اسیر مالٹا کا مثالی کردار

تحریک شیخ الہندؒ کے بارہ میں بعض شرمناک غلط بیانیوں کی حقیقت

"تحریک ریشمی رومال" نامی کتاب پر تبصرہ

قسط ۳

پھر مرتب نے اس کتاب کے صفحہ ۱۵۰ پر نمبرہ کے تحت اپنے الزام کے ثبوت کے طور پر اٹک کے رہنے والے کسی امیر احمد خان کا ذکر کیا ہے۔ اور اپنی روایت سے اس کی زبانی ایک طویل کہانی بیان کی ہے۔ اور اس سے استدلال کر کے لکھا ہے کہ "مولانا عزیر گل صاحب ہی وہ شخص تھے جو جاسوسی کیا کرتے تھے۔"

میں پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں اور قارئین کرام کو بھی پورا یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب کچھ لکھا ہوا اوّل سے آخر تک محض خود ساختہ افسانہ ہی افسانہ ہے۔ نہ اس نام کا کوئی شخص تھا۔ نہ وہ مرتب کتاب سے کبھی ملا ہے۔ نہ اس نے وہ باتیں کی ہیں جو بطور الزام نقل کی گئی ہیں۔ بالکل بے بنیاد کہانی گھڑنے اور فرضی نام اور فرضی حوالے دے دے کر اپنے خیال میں من گھڑت کہانیوں کو مستند بنا کر پیش کرنے میں واقعۃً اس مرتب کو کمال حاصل ہے۔ اگر زیادہ سے زیادہ جھوٹ گھڑنے، فرضی نظریات قائم کرنے اور بالکل جعلی اور غلط حوالے پیش کرنے پر کسی کو کوئی تمغہ اور انعام مل سکتا ہے تو یقیناً یہ مرتب ہی ایسے تمغوں اور انعامات کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور اس فن میں وہ اتنا باکمال ہے کہ کوئی بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد دیکھئے کہ ایک واقعہ کس نامناسب انداز میں پیش کر کے اپنے خیال میں اپنے الزام کے لئے ثبوت فراہم کیا ہے۔ لکھا ہے کہ: "حضرت شیخ الہندؒ کو انگریزوں سے کس قدر شدید نفرت تھی۔ لیکن حضرت شیخ کے یہی فدائی و شیدائی فنافی الشیخ صاحب ایک میم سے شادی رچاتے ہیں۔ اور وہ آج تک عیش اڑا رہے ہیں۔ الخ (ص ۲۵۲)

قصہ نومسلم انگریز خاتون کا اسلام نے جس کی زندگی کی کایا پلٹ دی

اس کے جواب میں ہم مجبور ہیں کہ یہ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھ کر حقیقت حال واضح کر کے اس الزام کو دفع کر دیں۔ یہ "میم صاحبہ" انگلستان کے ایک اونچے شاہی خاندان کی اور علمی ذوق رکھنے والی ایک ایسی خاتون تھی۔ جو محکمہ ریلوے کے ایک بہت بڑے درجہ کے افسر کی بیوی تھی۔ کافی عرصہ سے وہ ہندوستان میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اس کا ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی، وہ عرصہ دراز سے دنیا کے مختلف مذاہب و ملل کا تحقیقی اور تقابلی مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ اور تلاش حق میں لگی ہوئی تھی۔ وہ علمی ذوق رکھنے والی اور نہایت ہی ذہین و فطین تھی۔ طبیعت محققانہ اور ناقدانہ تھی۔ اور مدتوں ہر مذہب کی اساسی کتابوں کا مطالعہ پورے تدبر و تفکر کے ساتھ کرتی رہی۔ اور اسی سلسلہ میں قرآن مجید کا مطالعہ بھی ایک انگریزی ترجمہ اور مختصر تفسیری نوٹوں کی روشنی میں کیا۔ اور اس مطالعہ کے نتیجے میں اسلام کی حقانیت اس پر دلائل کیساتھ واضح ہو گئی۔ اور اسے یہ یقین حاصل ہو گیا کہ انسان کو دنیوی زندگی میں کامیابی اور حقیقی فلاح و بہبود کا راستہ اور آخرت میں نجات ابدی کا ذریعہ اسلام ہی کا نظام حیات ہے۔ اور اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ پر اس کا عقیدہ راسخ ہو گیا۔ ان دنوں میں وہ رڑکی (ضلع سہارنپور) کے قریب مشہور قصبہ منگلور میں مقیم تھی۔ اور اس قصبہ کے ایک لڑکے محمد علی کو متبنّٰی بنا لیا تھا۔ اس کے سامنے جب اس کا اظہار کیا۔ کہ میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں، کہاں جا کر اپنے اسلام کا اعلان و اظہار کروں۔؟ اور کس کے ہاتھ پر شرف قبول اسلام حاصل کروں۔ تو اُس نے مشورہ یہ دیا کہ دار العلوم دیوبند پورے ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک مسلّم دینی اور علمی مرکز ہے۔ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی وہاں کے شیخ الحدیث، صدر المدرسین اور ہندوستان بھر میں مشہور دینی رہنما ہیں۔ وہاں جانا چاہیئے۔ چنانچہ (غالباً ۱۹۳۲ء میں) وہ منگلور سے قبول اسلام کا ارادہ لے کر دیوبند آئی۔ اور حضرت مدنیؒ کے ہاں حاضر ہو کر اس نے کلمہ طیبہ پڑھا اسلام قبول کر کے وہاں سے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ قصبہ منگلور دیوبند سے قریباً ۱۴ میل دور ہے۔ مگر یہ راستہ پیدل کا ہے۔ اس زمانہ میں کسی قسم کی سواری کے لئے دونوں قصبوں کے درمیان کوئی سڑک نہیں تھی۔ دیوبند تک ریل کے ذریعہ آنا جانا ہوتا تھا۔ تو منگلور سے ۷ میل کے فاصلے پر رڑکی تک سڑک تھی اور رڑکی سے قریباً ۲۵ میل سہارنپور اور پھر سہارنپور سے قریباً ۲۲ میل دیوبند تھا۔ اس طرح فاصلہ ۵۰ میل سے زائد بنتا تھا۔ ان دنوں مولانا عزیر گل صاحب مدرسہ رحمانیہ واقع جامع مسجد رڑکی میں صدر مدرس تھے۔ اس لئے حضرت مدنیؒ نے اس نومسلم خاتون کو مشورہ دیا کہ قرآن مجید

کا مزید تحقیقی مطالعہ کرو اور جہاں کہیں مضامین قرآنی سمجھنے میں کوئی اشکال پیش آجائے تو یہاں کی بہ نسبت رڑکی آپ سے قریب ہے۔ وہاں جاکر حضرت مولانا عزیر گل صاحب کے سامنے اپنا اشکال پیش کرکے اُسے حل کیا کرو۔ اور ان کی رہنمائی میں دینی کتب کا مطالعہ کرکے تحقیقی طور پر دینی مسائل کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ آپ کے لئے علمی طور پر مفید ثابت ہوں گے۔ یہاں دیوبند آنا جانا راستہ کی دوری کی وجہ سے مشکل ہے۔ اور ان کو میرا قائم مقام سمجھو۔ اور ان سے استفادہ کرو۔

الغرض مسلمان ہو جانے کے بعد وہ منگلور میں اپنا بنگلہ بنواکر مقیم ہوگئی۔ خاوند یہاں سے ریٹائر ہوکر انگلینڈ چلا گیا تھا۔ مگر اسلام قبول کرنے کے باوجود اخراجات کیلئے وہ ماہوار دوسو روپیہ بھیجتا رہا۔ اس زمانہ میں ارزانی تھی۔ دوسو روپیہ اچھے گذارے کیلئے بالکل کافی رقم تھی۔ اس ماہوار آنے والی رقم سے وہاں منگلور میں اچھا گذارا کرتی رہی اور شب و روز مطالعۂ قرآن مجید اور دینی مسائل کی تحقیق میں مشغول رہا کرتی تھی۔ دوران مطالعہ میں کوئی خاص اشکال پیش آتا یا کوئی مسئلہ قابلِ تحقیق ہوتا تو حضرت مدنیؒ کے مشورہ کے مطابق بہ آسانی رڑکی جاکر مولانا عزیر گل صاحب مدظلہٗ سے پورے طور پر علمی اطمینان حاصل کرلیا کرتی تھی۔ اس آمد و رفت میں حضرت مولانا کی اہلیہ (مرحومہ) سے بھی اچھا خاصا تعارف و تعلق پیدا ہوا۔ اور اس سے اور اسی طرح مولانا کے چھوٹے بچوں بچیوں سے بھی خوب مانوس ہوگئی اور بچے اس سے مانوس ہوگئے۔

اس زمانہ میں مولانا کے یہ بچے اس کو 'مدر' کہا کرتے تھے۔ چھوٹے بچے زبیر کو جس کی عمر تقریباً پانچ سال تھی بارہا وہ رڑکی سے اپنے ساتھ منگلور لے جاتی اور یہ بچہ اپنے گھر کی طرح دو دو تین تین راتیں وہاں ہنسی خوشی گذارتا۔ سب چھوٹے بڑے اہل خانہ اس کو 'مدر' کہا کرتے تھے۔ اور وہ ان سب کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ پیش آیا کرتی تھی۔ اور وہ مولانا عزیر گل صاحب کے علمی اور عملی کمالات و فضائل کی خوب معتقد و معترف ہوگئی تھی۔ پورے خاندان کے ساتھ آمد و رفت، محبت و خلوص اور ارسالِ ہدایا و تحائف کا یہ سلسلہ دو تین سال تک ممتد رہا۔ غالباً رجب ۱۳۵۵ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت مولانا کی اہلیہ مرحومہ بچوں کے ساتھ رڑکی سے دیوبند اپنے گھر آئی ہوئی تھیں۔ حضرت مولانا عزیر گل صاحب مدرسہ رحمانیہ کے ایک کام کے سلسلے میں راندیر تشریف لے گئے تھے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کرچکا ہوں میں مولانا کے مکان کے باہر مردانہ حصہ میں دو اور عزیز رشتہ داروں کے ساتھ دوران طالب العلمی میں مقیم تھا۔ اور حضرت مولانا نافع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کر رہا تھا۔ مولانا کی اہلیہ مرحومہ نے مجھے بچوں کے ذریعہ یہ پیغام بھیجا کہ پرسوں منگلور سے مدر صاحبہ یہاں دیوبند ہمارے گھر آنے والی

ہے۔ اس نے اس کی اطلاع دی ہے۔ وہ بہت زیادہ صفائی پسند طبیعت رکھتی ہے۔ ہمارے مکان کا زنانہ حصّہ ایسا ہے کہ عرصہ دراز سے اسکی سفیدی بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے آج میں والدہ کے گھر چلی جاتی ہوں۔ گھر کا سامان ایک طرف کر دیا ہے آپ سفیدی کرنے والے کو بلا کر مکان کی خوب اچھی طرح صفائی کرادیں۔ تاکہ جب مدّرّ آجائے تو مکان صاف ستھرا ہو۔ اور صفائی دیکھ کر وہ خوش ہو۔ میں سفیدی کرنے والے کی تلاش میں تھا کہ دوپہر کے وقت معلوم ہوا کہ والدہ کے گھر میں مولانا کی اہلیہ محترمہ کا اچانک انتقال ہوگیا ہے۔ بڑے بچّے عبدالرؤف نے روتے ہوئے آکر اپنے عم محترم حضرت مولانا نافعؒ کو اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع دی۔ مولانا عزیز گل صاحب کو راندیر تار دے کر اس سانحہ کی خبر کردی۔ اسی روز تجہیز و تدفین ہوئی۔ مولانا راندیر سے تیسرے روز پہنچ گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے رہ گئے مولانا نے اس عظیم صدمہ کو نہایت صبر و استقامت کیساتھ برداشت کیا۔ اتفاق کی بات اس حادثہ کے چند روز بعد حضرت مدنیؒ کی اہلیہ محترمہ جناب مولانا اسعد میاں مدظلہٗ کی والدہ ماجدہ کا بھی انتقال ہوا۔ رجب اور شعبان کے دو مہینے گذر جانے کے بعد مولانا مدظلہٗ دیوبند میں مقیم تھے کہ منگلور سے مدّرّ کا خط آپ کے نام دیوبند آیا جس کا مضمون یہ تھا:

"—— آپ کی اہلیہ محترمہ کی وفات کے حادثہ کے بعد آپ کا گھر اجڑ گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے معصوم بچّے رہ گئے ہیں۔ جن کا سنبھالنے والا گھر میں کوئی نہیں۔ مجبوراً آپ کو گھر آباد کرنے اور بچوں کی خاطر دوسرا نکاح کہیں نہ کہیں کرنا ہوگا۔ اور ظاہر ہے جو بیوی بھی آئے گی وہ ان بچوں کی سوتیلی ماں ہوگی۔ اور سوتیلی ماں کی روش عموماً بچوں کے بارے میں فطری طور پر اچھی نہیں ہوتی۔ اور پھر اگر اس کی اولاد بھی ہوئی تو ان بچوں کیلئے اور مشکلیں پیش آئیں گی۔ میں اس وقت اسلام قبول کرنے کی وجہ سے آزاد ہوں۔ کسی کے نکاح میں نہیں۔ میری عمر قریباً پچاس برس ہے۔ اس لئے مجھے ویسے نکاح کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن اب مجھے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر جن کو اب تک میں نے اپنے بچوں کی طرح سمجھا تھا۔ آپ کے نکاح میں آجاؤں اور آپ کے گھر کو آباد کروں۔ مجھے نہ تو اولاد کی خواہش ہے اور نہ اب میری عمر اولاد پیدا ہونے کی ہے۔ اس لئے میں ان بچوں کیلئے کبھی بھی سوتیلی ماں نہیں بنوں گی۔ بلکہ ان کی پرورش ان کی اپنی ماں کیطرح کروں گی۔ نیز میرا نظریہ یہ بھی ہے کہ میں آپ جیسے شخص کے سایہ میں آجاؤں۔ اس لئے آپ نکاح کے لئے میری یہ درخواست ضرور قبول کیجئے ——"

مولانا مدظلہٗ نے اس خط کے جواب میں انکار لکھا اور انکار کی متعدد وجوہ میں سے چند اہم باتیں یہ لکھیں کہ میرے ہاں پردہ کی بہت زیادہ پابندی ہے اور آپ عمر بھر بے پردہ رہنے کی عادی رہی ہیں آپ سے اتنی شدید پابندی نہیں ہو سکے گی۔ میرا اپنا ذاتی مملوکہ مکان بھی نہیں۔ مدرسہ کے ایک تنگ مکان میں دن گذار رہا ہوں۔ آپ نے اب تک بڑی بڑی کوٹھیوں اور باغوں، پارکوں میں ساری زندگی گذاری ہے۔ ایسے مختصر سے مکان میں بود و باش کس طرح کر سکو گی۔ نیز میری آمدنی بالکل محدود ہے، مدرسہ سے معمولی تنخواہ ملتی ہے جس سے آپ کے معیار کے مطابق گذارا بالکل نہیں ہو سکتا۔ انہی وجوہ کی بنا پر میں نکاح کی یہ درخواست منظور نہیں کر سکتا۔"

——— اس خط کے جواب میں اس نے پھر منگلور سے ایک مفصل خط لکھ کر بھیجا۔ جس کا مضمون یہ تھا:

"آپ نے اپنے خط میں جتنی بھی شرطیں لکھی ہیں وہ سب مجھے منظور ہیں۔ نکاح سے پہلے پردہ کروں گی اور عمر بھر شریعت اسلامیہ کے مطابق پورا پردہ کرتی رہوں گی۔ اس بارے میں آپ بالکل مطمئن رہیں۔ ذرہ برابر خلاف ورزی نہیں ہوگی۔ میں ہر طرح کے مکان میں رہ سکتی ہوں۔ اور ہر طرح کا گذارا کر سکتی ہوں۔ مجھے خوراک پوشاک یا کسی اچھے معیار زندگی کی کوئی پرواہ نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ کے بچوں کی صحیح تربیت کروں۔ اور ازدواجی تعلقات کی بنا پر آپ کا سایۂ شفقت و مرحمت میرے سر پر ہو۔ اور میں اس سعادت کے حصول کے لئے ہر قیمت ادا کرنے پر تیار ہوں ———"

مولانا نے اس خط کے جواب میں مزید اعذار لکھے۔ اور اس معاملہ کو مختلف طریقوں سے ٹالنا چاہا۔ اس کے بعد کافی دنوں تک مکاتبت ہوتی رہی۔ اس کا اصرار برابر جاری تھا۔ اور مولانا مدظلہٗ کوئی عذر لکھ کر یا کوئی شرط لگا کر ٹالتے رہے۔ اس کا آخری خط جو اس سلسلہ میں مولانا کے نام آیا بہت زور دار مؤثر اور فصیح و بلیغ تھا۔ اس میں چند خاص مؤثر جملے اس مضمون کے تھے:

"اچھا، میں نے تو آپ کی عائد کردہ تمام شرطیں قبول کیں۔ جو مانع آپ نے بتایا میں نے اُسے دور کر دیا۔ اب حقیقت یہ ہے کہ آپ کے پاس نکاح نہ کرنے کے لئے عذر کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ اس کے باوجود اگر آپ میری اس درخواست کو قبول نہیں فرماتے تو قیامت کے روز اگر اللہ تعالیٰ مجھے اس بات پر گرفت کرے کہ تو نے اسلام قبول کرنے کے بعد زندگی کے دن کسی خاوند کے سایہ میں رہ کر کیوں نہیں گذارے

اور اس لباس کے بغیر کیوں رہی۔ تو میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی طرف سے معذرت پیش کروں گی اور عرض کر دوں گی کہ میں نے تو اپنے لئے ایک بہترین شخص کو منتخب کر کے اس سے نکاح کرنے کی ہر طرح کوشش کی تھی۔ مگر بلا وجہ اس نے انکار کیا، اور مجھے اپنے سایہ میں لے آنا قبول نہیں کیا۔ تو آپ ابھی سوچ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ کیا عذر پیش کر سکیں گے۔"

یہ خط و کتابت انگریزی میں ہو رہی تھی۔ حضرت مولانا مدظلہٗ خود تو انگریزی لکھ اور پڑھ نہیں سکتے تھے۔ اس لئے ان کے مخلص دوست اور خاص معتقد مولانا عقیل احمد صاحب بی اے (جو آجکل کراچی میں مقیم ہیں اور بہت سے دینی ادارے قائم کئے ہیں اور صاحب ارشاد بزرگ ہیں۔ اور ہزاروں ان سے بیعت کر کے روحانی استفادہ کر رہے ہیں۔) منگلور سے آنے والے خطوط کا مضمون سنا دیتے تھے اور آپ کیطرف سے پھر جواب میں انگریزی خطوط لکھ کر بھیجا کرتے تھے۔ ان سارے خطوط کے مضامین اور اور موثر انداز میں اصرار ان کے سامنے تھا۔ اس لئے اس آخری خط کے بعد اس نے بھی اصرار کے ساتھ مولانا مدظلہٗ کو مشورہ دیا کہ ہماری رائے بھی یہی ہے کہ آپ یہ درخواست ضرور قبول کیجئے۔ اور نکاح کر لیجئے چند اور دوستوں مخلصوں اور خیر خواہوں کو ان تفصیلات کا پتہ چلا تو انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ بلکہ خاص طور سے محرک اور باعث بنے۔ چنانچہ آخر کار رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کے آخری ایام میں ان دوستوں کو ساتھ لے کر آپ منگلور تشریف لے گئے۔ مدرسہ نے پہلے تو باقاعدہ پردہ کیا۔ اور پھر اس کے بعد مسنون طریقہ سے نکاح پڑھا گیا۔ اور نکاح ہو جانے کے بعد اس نے منگلور کی وہ کوٹھی اور باغیچہ اس متبنیٰ لڑکے محمد علی کو دیدیا اور وہاں سے صرف اپنا عظیم کتب خانہ بیل گاڑی میں لاد کر منگلور سے روڑکی لے آئی۔ اور یہاں آکر مدرسہ کے اس بالکل چھوٹے سے مکان میں رہائش اختیار کی۔ اس نکاح کے بعد انگلینڈ میں مقیم سابق خاوند نے دو سو روپیہ ماہوار کی رقم بند کر دی۔ اور اس کے بعد مولانا کی محدود اور معمولی سی آمدنی پر تنگی ترشی کے ساتھ گذارا کرتی رہی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس مومنہ قانتہ نے ہر پہلو سے پورا مجاہدہ کیا اور مومنات قانتات کیطرح اپنی گھریلو زندگی میں ہر طرح کی تنگی ترشی بہ صد خوشی برداشت کی۔ اور کبھی بھی کلمۂ شکایت زبان پر نہیں لائی۔ اس دوران میں اس نے ان بچوں کو خاص اپنے بچوں کیطرح سمجھ کر ان کی تربیت کا خاص اہتمام کیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے وہ ان کے لئے حقیقی ماں کی طرح ثابت ہوئی۔ چونکہ وہ وسیع علمی مطالعہ والی باذوق خاتون تھی۔ اس لئے شب و روز علمی مشاغل میں مصروف رہا کرتی تھی۔ چنانچہ انگریزی زبان میں اسلام اور عیسائیت کے بارے میں ایک کتاب تصنیف کی جو

ندوۃ المصنفین دہلی کے مشہور علمی ادارہ کیطرف سے شائع ہوئی اور مدتوں تک رسالہ "برہان" دہلی میں اس کتاب کا اشتہار شائع ہوتا رہا۔ نیز انگریزی زبان میں محققانہ انداز سے قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تفسیری نوٹ بھی لکھے۔

اس ترجمہ و تفسیر کے دوران حضرت مولانا کے ساتھ علمی مذاکرہ رہتا تھا۔ بحث و تحقیق ہوتی تھی۔ اور اس کے بعد نتیجہ میں جو آخری اور قطعی رائے قائم ہوجاتی اسکی روشنی میں قرآنِ مجید کے مطالب صاف و سلیس اور فصیح و بلیغ انگریزی میں لکھ لیتی تھی۔ وہ تفسیر مکمل ہوگئی تھی۔ اور اس زمانہ میں بمبئی کی ایک طابع و ناشر کمپنی کو طباعت و اشاعت کے لئے حوالہ کر دی تھی۔

نکاح کا یہ واقعہ غالباً نومبر ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۵ء تک مولانا کارڑکی میں قیام رہا۔ آمدنی کم تھی، اخراجات بڑھ رہے تھے۔ ۱۹۳۹ء کے بعد جنگِ عظیم دوم کی وجہ سے اشیائے ضرورت کے نرخ بھی زیادہ ہوگئے تھے۔ اور معمولی آمدنی پہ گذارا مشکل ہو رہا تھا۔ آپ نے سوختی لکڑیوں کی تجارت بھی کی مگر اس میں بھی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اسی کے مشورہ سے فیصلہ ہوا کہ رڑکی کی بجائے سخاکوٹ منڈی کے پاس اپنی آبائی زمین میں مکان بنوا کر رہائش اختیار کی جائے۔ وہاں سے آکر وقت وفات اکتوبر ۱۹۶۶ء تک وہاں اس چھوٹی سی بستی میں اس نے زندگی کے یہ دن گذارے ہیں۔ وہاں وہ دیہاتی عورتوں کا فی سبیل اللہ مفت علاج ہومیوپیتھک طریقہ سے کرتی رہی اور ساتھ ہی غریب دیہاتیوں کی ہر طرح کی امداد و اعانت اور خبر گیری کیا کرتی تھی۔ کسی معاملہ میں اور کسی موقع پر بھی اس نے "میم صاحبہ" ہونے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ صدق دل کے ساتھ اس اسلام قبول کرنے نے اسکی پوری زندگی اور سیرت و اخلاق میں ایک عظیم انقلاب پیدا کیا تھا۔ نکاح کے وقت سے لے کر وقتِ وفات تک پردہ اس قدر اہتمام کے ساتھ کرتی رہی۔ کہ قدیم الاسلام شرفاء کے خاندانوں اور بڑے بڑے دیندار گھرانوں میں بھی عورتوں کا ایسا پردہ نہ ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا رڑکی سے دیوبند تشریف لائے تھے وہ بھی ساتھ آئی تھیں۔ جب دونوں دیوبند سے واپس رڑکی جا رہے تھے تو مولانا مدظلہٗ کے ایک خادم و کفش بردار کی حیثیت سے میں بھی اسٹیشن تک گیا تھا۔ اسٹیشن پر میں نے دیکھا کہ از سرتا قدم نہایت ہی ساتر برقع میں مستور پوری پابندی کے ساتھ پردہ کئے ہوئے ایک گوشہ میں بیٹھی تھی۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ آیا۔ کہ دیکھئے خداوند تعالیٰ کی قدرت عظیم کا کرشمہ کہ یہ وہ عورت ہے کہ اسلام قبول کرنے سے قبل کس آزادی اور بے پردگی کے ساتھ ہندوستان بھر کے اسٹیشنوں پر پھری ہوگی۔ اور اب ایمان کی

دولت نصیب ہوجانے کے بعد رضائے الٰہی کی خاطر شرعی پابندیوں کو اس نے کس جذبۂ ایمانی کے ساتھ بصد خوشی قبول کیا ہے۔ اور اس وقت میرے دماغ میں حدیث ہرقل کا یہ جملہ فوراً تازہ ہوا۔ وکذٰلک الایمان اذا خالطت بشاشتہ القلوب۔ خدا و رسول کے احکام کے سامنے اطاعت و فرمان برداری کے ایسے ایسے نمونے پیش کرنا حقیقی اسلام ہے۔ اور اس اللہ کی بندی نے قبولِ اسلام کے بعد احکامِ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور بلا چون وچرا اطاعت کے ایسے ہی نمونے پیش کئے تھے۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء میں طویل بیماری کے بعد ۸۰ برس سے زائد عمر پاکر اُسی گاؤں میں اس کا انتقال ہوا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) اور وہاں ایک ٹیلہ پر واقع قدیم قبرستان میں درختوں کے جھنڈ میں اس کی تدفین عمل میں آئی ـــــ کہاں پیدا ہوئی۔ کہاں پرورش پائی۔ کہاں کہاں رہی بسی۔ اور آخر جاکر کس خاک میں مدفون ہوئی۔ وفات سے قبل تین چار سال متواتر شدید بیمار رہی۔ اس بیماری کے دوران اس نے صبر و استقامت اور اعتماد علی اللہ کا ایسا مظاہرہ کیا کہ پشتینی مسلمانوں کو ایسے مظاہر صبر و تقویٰ پیش کرنے کی توفیق بہت کم ملتی ہے۔ اس تیس۳۰ سال کے عرصہ میں اس نے اپنی زندگی کا معاشرتی اور معاشی معیار حضرت مولانا مدظلہٗ کی آمدنی کی مناسبت سے بہت معمولی رکھا تھا۔ اور "میم صاحبہ" والی کوئی بات اس میں نہیں تھی۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ سلیقہ شعار تھی۔ اور ہر معاملہ میں سلیقہ مندی اختیار کرنے کی وجہ سے معمولی آمدنی ہوتے ہوئے بھی عزت و آبرو قائم رہی اور کسی نے کوئی کمی محسوس نہیں کی۔

"میم صاحبہ کے ساتھ شادی" والی بات میں نے پوری تفصیل کے ساتھ اس لئے ذکر کردی تاکہ حقیقتِ حال کی پوری توضیح و تشریح ہوجائے۔ ؎

ضرور بود حکایت دراز تر گفتیم

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ کو انگریزوں سے انتہائی نفرت تھی۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ اس نفرت و عداوت کی بنیاد کوئی نسلی یا وطنی عصبیت نہیں تھی۔ بلکہ صرف اُن کا کفر، نصرانیت اور خدا و رسولؐ اور ان کے احکام و قوانین سے اُن انگریزوں کا برگشتہ ہونا ہی واحد وجہ نفرت و عداوت تھی۔ اور جب عداوت و نفرت اور تبرّی کی بنیاد کفر و طغیان ہو تو صدقِ دل کے ساتھ اسلام قبول کرنے اور احکام خدا اور رسول کو بہ دل و جان تسلیم کرکے ان پر عمل کرنے کے بعد نفرت بالکل ختم ہوجاتی ہے۔ اور اس طرح ایمان لانے والے اور اسلام قبول کرنے والے دوسرے مسلمان بھائیوں کی طرح محبوب اور آنکھوں کا تارا بن سکتے ہیں۔ مولانا مدظلہٗ کی یہ اہلیہ مرحومہ اگرچہ نسلاً انگریز تھی۔ انگلینڈ میں پیدا ہوئی تھی اور وہیں اس نے پرورش پائی تھی، لیکن جب اس نے علیٰ بصیرۃ مطالعہ اور تحقیق کے بعد اسلام قبول کیا ـــــ اور ایسا

کہ خاندانی مسلمانوں میں بھی اس جیسی اطاعت احکام خدا و رسولؐ اور صحیح فرمانبرداری کی مثال نہیں ملتی۔ تو الاسلام یھدم ما کان قبلہ کے مطابق نفرت وحقارت اور بغض و عداوت کی ساری بنیاد ختم ہوگئی۔ اور اب ارشاد خداوندی اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ۔ اور ارشاد نبوی ان اولیاءی اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ مَنْ کَانُوْا وَاَیْنَمَا کَانُوْا۔ کے مطابق وہ مسلمانوں کی برادری اور ان کی ولایت ومحبت کے دائرہ میں داخل ہوگئی تھی۔ انگریز ہونے کی نسلی حیثیت اور انگلینڈ کی پیدائش کی وطنی حیثیت اس ایمان کی وجہ سے اب باقی نہیں رہی۔ لہذا اس کے ساتھ اس کی خواہش بلکہ شدید اصرار کی بنا پر سنت نبوی کے مطابق نکاح کرنا صرف "شادی رچانا" نہیں تھا۔ بلکہ سنت نبوی کی پیروی اور موجب ہزار اجر و ثواب تھا۔ اور کسی پہلو سے یہ اعتراض کی بات نہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسئلہ کو ذرا اچھی طرح واضح کرنے کے لئے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی ایک مثال بھی پیش کردوں۔ اور اس مثال پیش کرنے سے مقصد صرف یہ ہے۔ کہ بڑے سے بڑے دشمن اسلام اور مبغوض قوم کی کوئی خاتون اگر اسلام قبول کرکے مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائے تو اس کے ساتھ نکاح کرنا قابل اعتراض ہرگز نہیں۔ اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نکاح کرنے والے نے اس دشمن اور مبغوض قوم کی عداوت کو دوستی سے بدل دیا اور وہ کافر قوم اب مبغوض اور قابل نفرت نہ رہی۔ قرآن مجید میں یہودیوں کے بارے میں صاف ارشاد ہے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَۃً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَھُوْدَ والذین اشرکوا۔ اور پھر یہودیوں کی پوری تاریخ بھی اس پر شاہد ہے۔ کہ مدینہ منورہ اور خیبر کے یہودی اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین دشمن اور بدخواہ تھے۔ اور وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کیسی مکروہ ترین سازشیں کرتے رہے۔ ان کے مقابلہ میں جہاد کرکے بہ زور شمشیر ان کو مغلوب ومقہور کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ لیکن جب اس مغضوب ومبغوض دشمن اسلام ومسلمین قوم کے ایک بڑے سردار کی بیٹی اور دوسرے بڑے سردار کی بیوی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا غزوۂ خیبر کے موقع پر مسلمانوں میں آکر شامل ہوئی

لہ مرحومہ کے قریبی عزیز مولانا عبداللہ کاکاخیل مدرس مدرسہ نیوٹاؤن کراچی جو مولانا عزیز گل مدظلہ کے بھتیجے اور مولانا عبدالحق صاحب نافع مرحوم کے صاحبزادہ ہیں انہوں نے اپنی چچی صاحبہ مرحومہ کی زبانی اسلام لانے کی کہانی ان الفاظ میں قلمبند فرمائی جس سے حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی قدس سرہٗ کے بارہ میں مرحومہ کے تاثرات بھی معلوم ہو جاتے ہیں:۔

چچی صاحبہ مرحومہ نے اپنی حیات میں مجھے اپنے قبول اسلام اور اس کے بعد کی ازدواجی زندگی

اور اسلام لے آئی۔ تو خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی دینی مصلحتوں اور حکمتوں کے پیش نظر حضرت صفیہؓ کے ساتھ نکاح کر کے اس کو ازواج مطہرات کے مقدس گروہ میں شامل فرمایا۔ اس کی انتہائی حوصلہ افزائی اور قدر افزائی فرمائی۔ مودت و رحمت کے ساتھ اس سے

کا قصہ زبانی سنایا تھا، اس قصے کے جو اجزاء مجھے اپنے خیال کے مطابق یقینی طور پر یاد ہیں سپرد قلم کرتا ہوں۔

چچی صاحبہ نے جنکو ہم سب "مدر" کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ فرمایا کہ مجھے بچپن کے زمانہ ہی سے موجودہ عیسائی مذہب کی حقانیت میں شبہ ہونے لگا تھا۔ بائیبل پڑھ کر طرح طرح کے اعتراضات میرے دل میں پیدا ہوتے تھے۔ جو لمبا اوقات ایک عجیب قسم کی بے چینی اور بے اطمینانی کا بھی باعث بن جاتے تھے، لیکن میں جب اپنی والدہ سے اس قسم کے شکوک و شبہات کا ذکر کرتی، تو وہ ڈرا دھمکا کر مجھے خاموش تو کر دیتی مگر دلیل و برہان سے کبھی اس نے مجھے مطمئن کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ وہ مطمئن کر سکتی تھی۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی میرے اس یقین میں اضافہ ہوتا گیا کہ جس دین کو ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا برحق سماوی دین سمجھ کر قبول کئے ہوئے ہیں وہ بڑی حد تک اپنی حقانیت کھو چکا ہے۔ تحریف کے ہاتھوں سے وہ محفوظ نہیں رہ سکا اور اس مقدس وحی میں بشری اذہان کے پیدا کردہ افکار و خیالات اور خود ساختہ حکایات و بیانات کی اس قدر آمیزش ہو گئی ہے۔ کہ حق و باطل اور صدق و کذب کی تمیز ہی مشکل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں نے اس دین کو چھوڑنے کا فیصلہ کر کے حق کی تلاش شروع کر دی، مشرف بہ اسلام ہونے سے قبل میں نے کئی ایک مذاہب کا قریب سے جائزہ لیا، بعض مذاہب میں تو ریاضت اور مجاہدات کے مراحل بھی بڑی حد تک طے کر لئے لیکن کسی بھی مذہب سے قلب کو اطمینان نصیب نہ ہوا اور حق کی تلاش بدستور جاری رہی، یہاں تک کہ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے میں نے انگریزی زبان میں مترجم قرآن مجید کا مطالعہ کیا اور پہلی بار کے مطالعہ ہی میں مجھ پر اسلام کی حقانیت منکشف ہو گئی اور میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہی وہ آخری دین ہے، جس کو قبول کرنے کے بعد مزید تلاش و جستجو کی کوئی حاجت نہیں رہے گی۔ قرآن مجید کے بعض حقائق کو سمجھنے میں میری وہ ریاضت اور مجاہدات ممد ثابت ہوئے، جن کے مراحل میں نے بعض دوسرے مذاہب کی روشنی میں طے کئے تھے ـــــ قرآن مجید کے مطالعہ کے بعد اسلام کے معتقدات،

پیش آئے۔ اور نسلاً بنو اسرائیل کی یہ خاتون جو خیبر کی رہنے والی یہودیہ تھی قبول اسلام کے بعد ام المومنین بن گئی۔ اور آج ہمارے لئے شرعاً ضروری ہے کہ اس کا انتہائی احترام کریں۔ اور اس کا نام نامی عزت و تکریم کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ساتھ ملا کر لیا کریں۔ اگر آج کوئی بدبخت مستشرق یہ گستاخی کر جائے۔ (نعوذ باللہ) کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تو یہودیوں سے انتہائی نفرت تھی، ان سے قتال

عبادات، معاملات اور اخلاق کا اجمالی طور پر علم تو ہوا، لیکن ان کی تشریح و تفصیل سمجھنے کے لئے میری طلب الجھی جاری تھی، نیز مجھے یہ اطمینان حاصل کرنے کیلئے بھی دین کے راسخ علماء کے پاس جانے کی ضرورت تھی کہ اسلام کے معتقدات اور قرآن مجید کے بعض دوسرے حقائق جس طرح میں اپنے مطالعہ سے سمجھی ہوں۔ آیا وہ علماء دین کے نزدیک صحیح بھی ہیں یا نہیں۔؟ چنانچہ اس مقصد کیلئے میں نے منگلور سے بعض مسلمانوں کے مشورہ سے دیوبند کا رخ کیا۔ دیوبند کے کسی خاص عالم یا بزرگ کا نام پہلے سے معلوم کر کے میں نہیں گئی تھی بلکہ دارالعلوم دیوبند پہنچ کر میں نے یہ دریافت کیا کہ یہاں کے سب سے بڑے عالم دین کون ہیں جن کے پاس جا کر میں دین کے کچھ معلومات حاصل کر سکوں۔؟ اتفاق سے جس شخص سے میں نے یہ دریافت کیا تھا وہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب مرحوم کے عقیدتمند یا مرید تھے، وہ مجھے علماء کی ایک مجلس میں لے گئے جہاں حضرت میاں صاحب مرحوم اور ان کے علاوہ اور بہت سے علماء تشریف فرما تھے۔ میرے ساتھ میری جواں بیٹی بھی تھی۔ اس شخص نے حضرت میاں صاحب کیطرف اشارہ کیا۔ کہ آپ ان کے پاس چلی جائیں یہ بہت بڑے عالم اور بزرگ ہیں۔

میری نگاہ اچانک شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی مرحوم پر پڑی جو اس وقت بالکل ایک غیر نمایاں جگہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اگرچہ اس وقت تک مجھے ان کے کچھ زیادہ حالات معلوم نہ تھے۔ صرف ان کا نام ہی سنا تھا۔ لیکن تمام حاضرین مجلس کے مقابلہ میں ان کی عظمت اور شان میرے دل میں زیادہ جاگزیں ہوئی، شاید میرے قبل از اسلام کے مجاہدات کو بھی اس ادراک میں کچھ دخل ہو، ویسے مجھے جس چیز نے اول دہلہ میں زیادہ متاثر کیا وہ حضرت مدنی مرحوم کی ایک خاص ادا تھی۔ اور وہ یہ کہ جب ان علماء کرام نے ہم دونوں (ماں، بیٹی) کو بے پردہ دیکھا تو کسی نے منہ پر چادر ڈالی، کسی نے منہ دوسری طرف موڑا اور کسی نے اعراض کا کچھ اور طریقہ اختیار کیا، لیکن حضرت مدنی رہتے کہ انہوں نے اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کی صرف اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور نہایت وقار اور سکون کے ساتھ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ہمیں اس وقت کچھ یوں محسوس ہوا کہ اس ایک شخص کے علاوہ

کیا۔ ان کو قتل کیا۔ ان کو مغضوب علیہم قرار دیا۔ تو پھر ایک یہودیہ عورت سے نکاح کیوں کیا۔" تو کیا یہ اس کا فضول بکواس اور تمام اسلامی تعلیمات کو نظر انداز کر کے بیہودہ اعتراض نہ ہوگا۔ یقیناً یہ اعتراض بالکل فضول، سراسر لغو اور اسلام کی تعلیمات سے بالکل جہالت، یا پھر خالص بغض وعناد اور کینہ وحسد پر مبنی ہوگا۔ اسلام قبول کرنے اور ازواج مطہرات کے زمرہ میں شامل ہو جانے کے بعد حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی کیا قدر و منزلت تھی۔ اس کی جھلک اُن روایات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ جو کتب احادیث اور

بقیہ حضرات ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر انکو ہمارے مسلمان ہونے کا علم نہیں تو ایک انسان ہونے کی حیثیت سے بھی سلوک احترام کا ہونا چاہیئے تھا۔ دین کے احکام سے تفصیلی واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہ نہ سمجھ سکیں کہ ان میں سے ہر شخص نے غیر محرم اور بے پردہ عورتوں سے نگاہ بچانے کیلئے اپنا اپنا طریقہ اختیار کیا ہے۔ بہرحال دل یہی کہہ رہا تھا کہ ہمیں اسی بزرگ (حضرت مدنیؒ) کی خدمت میں ہی حاضر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ہم دونوں ان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حضرت نے جو کہ غضِّ بصر کئے ہوئے تھے، دریافت فرمایا کہ آپ اسلام قبول کرنے کے لئے آئی ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، اسلام تو میں قبول کر چکی ہوں، میں اپنے اسلام کا امتحان دینے کے لئے آئی ہوں کہ آیا میں نے کس حد تک قرآن مجید کو صحیح سمجھا ہے؟ نیز قرآن پاک کے جو مجمل احکام تفسیر وتشریح کے محتاج ہیں ان کے معلومات حاصل کرنا بھی میرا مقصد ہے۔

حضرت نے مجھ سے میرے اسلامی معتقدات کے بارے میں چند سوالات کئے اور میں نے ان کے جوابات دئے حضرت نے تواضعاً فرمایا کہ آپ مجھ سے اچھی مسلمان ہیں۔ پھر حضرت نے کلمہ شہادت کی تلقین ایک ایک لفظ کر کے عربی زبان میں کرادی، اختصار کے ساتھ دین کے کچھ احکام اور حقائق بیان فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا جنّت جانے کیلئے آپ سے بیعت مفید ثابت ہوگی؟ ہنسنے لگے اور فرمایا کہ: "شاید" پھر میں نے بیعت کی درخواست کی حضرت نے اپنی چادر پکڑا کر بیعت کرادی۔ اس وقت میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ اور حضرت مدنیؒ کی عقیدت کچھ اس طرح دل میں جاگزیں ہوئی کہ میری نگاہوں میں اس وقت سے انسانوں میں ان سے عظیم تر انسان کوئی اور نہ تھا۔

اتنے میں کھانے کا وقت ہوا، حضرت نے فرمایا کہ آپ دونوں ہماری مہمان ہیں۔ لیکن جس دین کو آپ قبول کر چکی ہیں اس کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ غیر محرم عورتوں کے ساتھ اختلاط جائز

کتب سیر و تواریخ میں اس کے حالات کے ضمن میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن حجرؒ نے اپنی مشہور کتاب الاصابہ میں طبقات ابن سعد کے حوالہ سے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ کہ حضرت صفیہؓ جب خیبر سے مدینہ منورہ تشریف لائیں اور اس کو حضرت حارثہ بن النعمان کے گھر ٹھہرایا گیا اور انصار مدینہ کی عورتوں نے اس کے حسن و جمال کا شہرہ سنا۔ تو وہ اس کا حسن و جمال دیکھنے آئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی نقاب اوڑھ کر اس کو دیکھنے کیلئے وہاں تشریف لے آئیں۔ جب دیکھ کر باہر نکلی۔ تو جناب

نہیں ہے۔ اس لئے ہم اپنی مجلس میں آپ کو شریک کرنے سے معذور ہیں۔ اس کو آپ توہین نہ سمجھئے۔ بلکہ یہ دین کا حکم ہے۔ جس کے قبول کرنے میں ہم سب کے دین و دنیا کا فائدہ ہے۔ یہ سنکر حضرت مدنیؒ کی عظمت اور دل میں بڑھ گئی کہ یہ کس درجے کے حساس اور باریک بین بزرگ ہیں۔ دین کا حکم بتلانے میں حکمت کے کن دقیق اصولوں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ دین کا حکم سمجھایا بلکہ ہماری نفسیات کا بھی کتنا خیال رکھا! الغرض ان کی ایک ایک ادا سے اخلاق اسلامی کا وہ مجسم نمونہ ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! اس بات کی آپ فکر نہ کیجئے کہ ہم مجلس سے علیحدگی کو ناگوار محسوس کریں گی۔ اگر ہمیں اسلام کا یہ حکم نہ بھی بتلایا جاتا تو طبعاً بھی ہمیں یہ گوارا نہ تھا کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر ایک ہی تھال میں سب ہاتھ ڈال کر اکٹھے کھانا کھائیں۔ ہمارا ابھی وہ تزکیہ نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ہی توکل کا وہ مقام ہمیں حاصل ہے کہ طبعی ہدایات سے چشم پوشی کر کے جراثیم کے متعدی ہو جانے سے بالکل بے خوف و خطر بن جائیں۔ دین کے حکم ہونے کے علاوہ ہماری طبیعت کا تقاضی بھی یہی ہے کہ ہم الگ کھانا کھائیں۔ چنانچہ ہمارے کھانے کا علیحدہ انتظام ہوا۔

حضرت مدنیؒ نے میرے مستقل تعلیم دین کا یہ انتظام فرمایا کہ تمہارے عم محترم (مولانا عزیز گل مدظلہ) کو جو منگلور سے چند میل کے فاصلہ پر رڑکی کے ایک مدرسہ میں صدر مدرس تھے اس بات پر مکلف کیا کہ وہ ہفتہ میں ایک دو بار مجھے دین کے احکام سمجھایا کریں، چنانچہ میں ان کے مکان پر حاضری دیا کرتی تھی، اور ان کے بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے درس لیا کرتی تھی۔

ہماری تعلیم کا سلسلہ جاری تھا کہ تمہاری چچی کا مختصر سی بیماری (غالباً ولادت کی بیماری) کے بعد انتقال ہوا۔ اس حادثہ سے میری تعلیم کا متاثر ہونا بھی ایک طبعی امر تھا۔

کچھ عرصہ اسی طرح گذرا اس کے بعد حضرت مدنیؒ نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کا نکاح سابق شوہر سے، جو اپنے کفر پر اڑا ہوا ہے، ٹوٹ چکا ہے۔ میں آپ کے دین کی بہتری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئے۔ اور اس کو خطاب کر کے فرمایا: کیف رایتیہ یاعائشۃ۔ (اے عائشہ تو نے اُسے دیکھ کر کیسے پایا۔) اس نے فرمایا: رأیت یہودیۃ۔ (میں نے یہودیہ کو دیکھ لیا) آپ نے فرمایا: یاعائشہ لاتقولی ذلک فانھا اسلمت وحسن اسلامھا۔ (ایسی بات مت کہو۔ اس لئے کہ وہ یقیناً مسلمان ہو چکی ہے۔ اور بہت اچھی طرح اسلام لے آئی ہے۔)۔۔۔ (الاصابہ ج ۴ ص ۳۴۸ زرقانی شرح المواہب اللدنیہ ج ۳ ص ۲۵۹)

دوسرا واقعہ اسی ابن سعدؒ کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ ایک سفر میں حضرت صفیہؓ کی سواری کا اونٹ بیمار ہو کر سواری کے قابل نہیں رہا۔ اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں ضرورت سے

اس میں سمجھتا ہوں کہ آپ ازدواجی زندگی میں آجائیں اور جس شخص کو میں نے آپ کا مربّی مقرر کیا ہے اگر اس کے ساتھ آپ کا نکاح ہو جائے تو یہ آپ کے لئے بہت ہی باعث سعادت ہوگا۔ جس دین کی تعلیمات کے حصول کیلئے آپ پریشان و سرگرداں ہیں جس کی خاطر آپ نے اپنی دنیا کی ہر دولت اور ہر راحت کو قربان کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس تعلیم کا ایک مستقل انتظام ہو جائے گا۔

الغرض میرے شیخ و مرشد حضرت مدنیؒ مرحوم نے اس نکاح کی اہمیت کو میرے دل میں کچھ اس طرح اتارا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ میری اخروی سعادت کے لئے یہی ایک راستہ ہے۔ کہ میں اپنی آرام و آسائش کی زندگی، اپنی دولت، دنیوی وجاہت، خویش و اقارب اور ملک و وطن کو خیرباد کہہ کر اس غریب اللسان کے ساتھ اپنی زندگی وابستہ کر دوں جو مجھے دنیا کی راحت تو نہیں پہنچا سکے گا۔ لیکن علم دین اور خشیت الٰہی کی دولت سے مجھے ضرور مالامال کر دے گا۔

میں نے حضرت مدنیؒ سے عرض کیا کہ مجھے اتنی مہلت دی جائے کہ میں اپنے بچوں سے جو ملک گئے ہوئے ہیں اجازت طلب کر لوں۔ حضرت نے اسکو تسلیم کر لیا۔ چنانچہ میں نے اپنے بچوں کو صورت حال سے آگاہ کر کے ان سے اجازت طلب کی۔ گو ان کی اجازت پر اصل مسئلے کا توقف کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ تاہم میری خواہش یہ تھی کہ ان کی اجازت ہونے کے بعد یہ کام ہو۔ تو زیادہ بہتر ہوگا۔

اس دوران حضرت مدنیؒ نے تمہارے تایا (مولانا عزیر گل مدظلہ) کو بھی آمادہ کرنے کی کوشش کی اور جب وہ آمادہ ہو گئے تو حضرت مدنیؒ نے مجھے پیغام بھیجا کہ وہ آمادہ ہیں اور آپ بھی آمادہ ہیں۔ بچوں کے جواب میں تاخیر ہو گئی اور اصولاً ان کے جواب پر کوئی توقف بھی نہیں ہے یہ محض

زائد سواری کے اونٹ موجود تھے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضؓ سے فرمایا کہ صفیہ رضؓ کا اونٹ بیمار ہو کر سواری کے قابل نہیں رہا۔ اگر آپ اپنے ہاں سے ایک اونٹ اسے دیدیں تو بہتر ہوگا۔ اس نے جواب میں کہا : انا اعطی تلک الیھودیة۔ (کیا میں اس یہودیہ کو دوں) حضرت صفیہؓ رضی اللہ عنہا کے بارے میں ان الفاظ کے استعمال کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ناراض ہوگئے اور آپ نے ذوالحجہ اور محرم دو ماہ یا تین ماہ تک اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔ حضرت زینب رضؓ فرماتی ہیں : حتیٰ یئست منہ (یہاں تک کہ میں آپ کی تشریف آوری سے نا امید ہوگئی) ——— (الاصابہ ج ۴ ص۳۳ ، زرقانی جلد ۳ ص ۲۵۹)

ترمذی شریف میں حضرت صفیہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر

تطییب خاطر کیلئے ہے۔ ہم مجلس نکاح کا انعقاد فلاں تاریخ کو کریں گے۔ آپ کو قبول کرنا ہوگا۔ اور یہ تاریخ بہت ہی قریب کی تاریخ تھی۔

یہ حکمنامہ جب وصول ہوا تو میرے لئے مزید کلام کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ مقررہ تاریخ کو نکاح ہوگیا۔ نکاح ہو جانے کے چند روز بعد بچوں کا خط آیا کہ ہماری طرف سے بالکل اجازت نہیں ہے۔ اس میں بھی قدرت کیطرف سے بہتری تھی۔ اگر ان کے جواب کا بہر حال انتظار ہی کیا جاتا اور جواب پھر نفی میں ملتا۔ تو حضرت مدنیؒ کے حکم پر عمل کرنے میں جو خود میری ہی سعادت کا باعث تھا۔ مزید مجاہدہ کی ضرورت پیش آتی۔

یہ تمام تفصیلات میں نے تائی صاحبہ سے خود سنی ہیں۔ غالباً حضرت مدنیؒ قدس سرہ کی ترغیب و تحریض کے بعد جب وہ نکاح کیلئے آمادہ ہوئی ہوں گی تو انہوں نے یہ خط و کتابت کی ہوگی جس کا تذکرہ حضرت مفتی صاحب نے کیا ہے۔

یہ چونکہ میری پیدائش سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اس لئے اس کی بعض تفصیلات معلوم کرنے میں میں بھی اپنے اساتذہ کی معلومات کا محتاج ہوں۔ استاذ محترم حضرت مفتی صاحب مدظلہ کی تحریر میں چونکہ یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس نکاح کے اصل محرک شیخ الاسلام حضرت مدنی قدس سرہ العزیز تھے۔ اس لئے اس اہم جزو کا میں نے اضافہ کر دیا۔ اور اختصار ذکر کرنے کی بجائے مناسب یہی معلوم ہوا کہ مرحومہ کی زبانی بیان کردہ قصہ اپنے الفاظ میں پیش کر دوں۔ گو اس میں کچھ تطویل، بے ربطی اور تکرار بھی ہو جائے۔ (عبداللہ کاکاخیل)